Al-Qirtas
ARABIC

ISSN Online : 2709-6076
ISSN Print : 2709-6068

A Critical Analysis of Khalida Hussain's Selected Short Stories

خالدہ حسین کے منتخب افسانوں کا تنقیدی جائزہ

Al-Qirtas
Arabic

Dr. Faiza Butt
Amber Maria
Rabbia Shahzadi

Assistant Professor, Department of Urdu, Kinnaird College for Women, Lahore at- drfaizabutt@gmail.com
Research Scholar, M. Phil, Forman Christian College, Lahore.
Research Scholar, M. Phil, University of Education, Lahore.

Abstract

Khalida Hussain is a known fiction writer of Urdu literature. She is well known and admired for her exceptional use of symbolism in her short stories. By using her symbolic elements, she brings depth and layers of meaning to her short stories, allowing readers to dive into the hidden meanings and truths within the lines of her write ups, and uncover the deeper emotion and complexities of her characters. Khalida Hussain's mastery of symbolic story writing adds a rich and thought provoking dementions to her work. Her symbolic technique adds a unique and multi dimentional aspect to her art of story writing. Through her use of symbolic techniques Khalida Hussain explores the power dynamics and ideologies that shape society, much like the research on political leaders and their use of language.

Key Words: Khalida Hussain, Symbolism, Short Stories, Fiction, Hidden Meanings.

موضوع کا تعارف:

جب خالدہ حسین نے لکھنا شروع کیا تو وہ دور مارشل لاء فسادات، بندشوں اور افراتفری کا دور تھا۔ بکھری ہوئی فضا تھی۔ یہ جنرل ضیاء الحق کا دور تھا۔ اس دور میں کئی تحریکیں بنی اور کئی ٹوٹیں۔ کوئی بھی انسان کھل کر بات نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اگر تو کھل کر بات کرتا اور اس کے الفاظ حکومت کو ناگوار گزرتے تو الزامات لگا کر اس پر سزا کا حکم دے دیا جاتا ہے۔ اس لیے ہر انسان صاف گوئی سے ڈرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسی دور کے فن کاروں اور ادباو شعرا نے صاف گو انداز چھوڑ کر علامتی انداز اپنایا اس طرح ان کی بات بھی بیان ہو جاتی تھی اور کسی نوع کی گستاخی کا جواز بھی باقی نہیں رہتا تھا۔ کیونکہ علامتی طرزِ بیان کا بنیادی حسن اور فائدہ یہی ہے کہ کسی بھی بات سے بہ آسانی مکرا جا سکتا ہے۔ علامت تو علامت ہوتی ہے، لہٰذا اس کے کئی مطلب نکالے جا سکتے ہیں۔ البتہ یہ بھی سچ ہے کہ تحقیق و تنقید کرنے والے حضرات، ادباء اور شعراء کی بیشتر علامتوں اور ان کے مطالب سے واقف ہو جاتے ہیں۔

خالدہ حسین کو اردو افسانے میں اہم اور نمایاں مقام حاصل ہے۔ اِن کا فن تانیثیت کے حوالے سے بھی قابلِ قدر ہے۔ اِن کے فن کو اردو افسانوی ادب میں بلند اور واضح تانیثی آواز کی حیثیت حاصل ہے۔ انہوں نے بھی علامتی انداز اپنایا۔ مگر ادیب ہو یا شاعر، ہر تخلیق کار اپنا منفرد اسلوب اور فن رکھتا ہے۔ یہی انفرادیت انھیں نہ صرف دوان بخشتی ہے بلکہ ان کے نام اور کام کو دنیا کی بھیڑ میں کھو جانے سے بچاتی ہے۔

Al-Qirtas ARABIC
ISSN Online : 2709-6076
ISSN Print : 2709-6068

خالدہ حسین کی علامت نگاری:

خالدہ حسین نے بھی اپنے ہم عصروں کی طرح اپنے دور کے عصری تقاضوں کے پیشِ نظر علامتی طرزِ بیاں کا انتخاب کیا۔ان کی تحریریں علامتی انداز کا نادر مرقع ہیں ہے۔اگر دیکھا جائے تو ان کی کوئی بھی تخلیق علامت نگاری کے بغیر نہیں۔ان کے افسانوں میں بھوک، کمزوری، بے بسی، نقاہت درد، وقت اور اساطیری علامتیں پائی جاتی ہیں۔اردو ادب کی نام ور ناول نگار، قرۃالعین حیدر نے دورانِ ملاقات ان سے سوال کیا کہ آپ کی تحریروں میں گرفت سے آزاد ہونے کی شدید آرزو نظر آتی ہے تو جواب میں خالدہ حسین نے کہا:

دراصل وقت کی گرفت سے نکلنے کی تمنا یا حسرت ان معنوں میں شاید استعمال نہیں کی بلکہ وقت کو سمجھنے کی خواہش ضرور کی ہے۔وقت لمحات کا تسلسل نہیں بلکہ یہ انسانی روح کا ایک تجربہ ہے۔اقبال نے بھی وقت کو اپنے باطن میں محسوس کیا ہے۔وقت کو میں جس شدت سے محسوس کرتی ہوں وہ حقیقت کے قریب جانے کی آرزو ہے۔۔۔وقت سب سے بڑی طاقت ہے۔[1]

خالدہ حسین اکثر اوقات "شاید" کا لفظ اپنے جوابات میں استعمال کرتی ہیں جبکہ کسی فنکار سے اس کی فنکاری کے بارے میں پوچھا جائے تو فن کار کو شاید کا لفظ استعمال کرنا زیب نہیں دیتا۔خالدہ حسین "شاید" لفظ کے استعمال سے دراصل اِس امر کا اظہار کرتی ہیں کہ وہ کھل کر کسی حقیقت یا چیز کے متعلق زیادہ بیان نہیں دے سکتیں۔

فطری مظاہر کے سامنے انسان کی بے بسی و بے چارگی کی کہانی کو خالدہ حسین نے بڑے سبھاؤ کے ساتھ بیان کیا ہے۔ان کی تخلیقی سطح پر استعارہ، علامت اور تجربہ، اک جہانِ معنی سامنے لاتا ہے۔ان کے علامتی انداز کے بارے میں ناقدین اور محققین کی رائے کچھ مختلف ہے۔بعض کا کہنا ہے کہ وہ کسی کو بھی جلد سمجھ میں نہیں آتیں۔بعض کا کہنا ہے ہر قاری کو سمجھ نہیں آتیں۔اور بعض کا کہنا ہے کہ ان کی تحریر ابتدا میں الجھی ہوتی ہیں لیکن جیسے جیسے ان کو پڑھتے جائیں تو علامتوں کی گرہیں کھلتی جاتی ہیں۔امینہ بی بی خالدہ حسین کی علامت نگاری کے بارے میں لکھتی ہیں:

اگرچہ ان کی علامت کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ وہ عام فہم نہیں ہے اور بین السطور پہنچنے کے لیے ذہنی کاوش کرنا پڑتی ہے۔لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ علامات پیچیدگی سے آسانی تک کا سفر طے کرتی ہیں اور کہانی کے اختتام تک واضح ہوتی جاتی ہیں۔یہ علامات نہ صرف فرد کے داخل اور باطن کی کشمکش نمایاں کرتی ہیں بلکہ ان کی تشخیص کی جڑ تک پہنچنے میں بھی اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔[2]

ان کی اکثر علامات پرانی کہاوتوں اور اساطیری کہانیوں کے ساتھ جڑی ہوتی ہیں۔جس کی سب سے شاندار مثال ان کا افسانہ **"سواری"** ہے۔سواری افسانے کی تخلیق میں کہیں لاشعور کی دور اندھیری وادی میں چھپا ماضی بھی ہے اور خالدہ حسین کے عصری حالات بھی۔یوں لگتا ہے کہ جیسے خالدہ علامات کو لاتی نہیں بلکہ علامات میں سوچتی ہیں۔

تحریروں پر شخصیت کے اثرات اور نفسیات:

ادیب اپنے اسلوب سے کبھی جدا نہیں ہو سکتا۔وہ اپنی تحریروں میں بولتا ہے۔اس کا کردار، نفسیات اور اس کی شخصیت، اس کا مزاج اور یہاں تک کہ اس کی عادتیں بھی اس کی تحریر میں موجود ہوتی ہیں۔ ادیب کے لفظوں سے اس کی شخصیت چلتی ہے اور اس کی یہی شخصیت اس کی مکمل نفسیات کو بیان کرتی ہے۔اور یہ نفسیات معاشرے، گردو نواح اور جن حالات میں مصنف پلا بڑھا ہوتا ہے ان کی بھی عکاسی کرتی ہے۔خالدہ حسین اپنے لکھنے کا جواز بتاتے ہوئے اپنی تخلیقی عمل کی وضاحت یوں کی ہے:

جب میں اپنے آپ کو محسوس کرنا چاہتی ہوں تو لکھتی ہوں۔کہانی لکھنے کا عمل صرف میرے لیے اپنے وجود کا رشتہ قائم رکھنے کی ایک کوشش ہے۔ان دونوں دنیاؤں کے ساتھ جو میرے اندر اور باہر بہتی ہیں۔۔۔شاید فنا کے خوف سے چھٹکارا اور زندگی کی محبت مجھے لکھنے پر مجبور کرتی ہے۔[3]

خالد حسین کی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو انھوں نے کوئی بھرپور زندگی نہیں گزاری۔بلکہ ایک عام نفسیاتی زندگی گزاری ہے۔معاشرتی اور گھریلو بندشوں میں مقید زندگی۔ان ہی بندشوں کو توڑ کر بھاگ نکلنے کی خواہش کے پیشِ نظر ان کی تحریروں میں نمایاں مایوسی کے رنگ اور اس کی گرفت سے نکلنے کی تمنا ملتی ہے، لیکن انھوں نے کبھی

Al-Qirtas ARABIC
ISSN Online : 2709-6076
ISSN Print : 2709-6068

بغاوت نہیں کی۔اور نہ ہی ان کی تحریروں میں بغاوت کا عنصر ملتا ہے۔ لہٰذا ان کے افسانوں کو سمجھنا اتنا آسان نہیں جتنا لگتا ہے،یعنی ان کے افسانوں میں دوہری حقیقت سفر کرتی محسوس ہوتی ہے۔

ان کے افسانوں میں ہمیں سماجی اور معاشرتی بے اعتنائیوں کا دکھ واضح محسوس ہوتا ہے۔اور ان کے مطالعے سے ہمیں اپنی زندگی کی سچائیوں سے آگاہی ملتی ہے۔ان کے افسانے انسانی زندگی کی مختلف جہات اور نفسیات کی کئی مخفی پرتوں کی وضاحت سے متعلق ہیں کہ جن کا مطالعہ قاری کو اپنے سحر میں گرفتار کر لیتا ہے۔خالدہ حسین کے افسانوں کی نفسیاتی فضا سے متعلق ڈاکٹر محمد اجمل کا کہنا ہے:

وہ فن پارے جو اسلوب مین علامتی ہوں اور واقعات اور حادثات کو اس طرح پیش کریں کہ وہ علامت بن کر ذہن میں جذبہ حیرت کا محرک بنیں،نفسیاتی تبصرے کی ایک دلآویز دعوت بن جاتے ہیں۔۔۔اپنے افسانوں میں خالدہ حسین نے اس شہر کو قائم رکھا اور یہ وہ فضا ہے جو دور رس بھی ہے اور دلآویز بھی۔[4]

خالدہ حسین کے ہاں نفسیاتی عناصر بھی اپنا اثر دکھاتے ہیں۔یہ عناصر انسانوں کے داخلی اور باطنی تجربات اور اس کے نتیجے میں ہونے والی شکست وریخت کو اپنی کہانی کے قالب میں ڈھال لیتے ہیں۔اور وہ اس مقصد کے لیے علمِ نفسیات کی اصطلاحات: شعور،لاشعور اور تحت الشعور سے کام لیتی ہے۔

اسلوب:

لکھنے والے کے اسلوب میں ساٹھ سے ستر فیصد اس کے مطالعاتی مواد کا حصہ ہوتا ہے۔بلاشبہ ایک فن پارے کی تخلیق ملکی ادب کے علاوہ غیر ملکی ادب کے مطالعے کی بھی متقاضی ہوتی ہے۔ ملکی و غیر ملکی ادب کے وسیع مطالعے سے فکری پرواز میں آفاقیت کا احساس ہوتا ہے۔اور اس حقیقت تک رسائی نسبتاً آسان ہو جاتی ہے کہ کس طرح کسی دوسری تہذیبوں میں انسانی مسائل کی صورتحال بالکل ہمارے یہاں کے مسائل سے مماثل ہے۔خالدہ حسین نے غیر ملکی ادیبوں کو پڑھا اور ان کے سوچنے کا انداز اور پسند بدلتی گئی۔پہلے پہل انھوں نے یہودی ادیبوں کی تخلیقات کو پسند کیا۔پھر روسی اور جرمن ادبا سے قرب محسوس ہوا۔اس حوالے سے خالدہ حسین کہتی ہیں:

دوستووسکی اس دنیا کا سب سے بڑا لکھنے والا ہے۔اس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے زندگی کی حقیقی بیماریوں،جہالت اور ناانصافیوں کو ایسی ڈی اٹیچمنٹ کے ساتھ لکھا ہے کہ اس میں نہ جذباتیت ہے،نہ جھنجلاہٹ اور نہ ہی پروپیگنڈا۔[5]

خالدہ حسین دوستووسکی سے متاثر بھی تھیں اور خود بھی اسی طرح کا جذبہ رکھتی تھیں۔ان کی کہانیوں میں بھی زندگی کی تلخیاں ملتی ہیں۔

بہت سے افسانہ نگاروں کی کہانیوں کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے احساسات ان کے اندر سے جنم نہیں لیتے بلکہ وہ کچھ زبردستی پھنس گئی چیزوں میں اپنے تئیں اپنے احساسات کا گمان کر رہے ہیں۔لیکن اس کے برعکس خالدہ حسین کے افسانوں کا اسلوب ان کے علامتی طرزِ تحریر میں جان ڈال دیتا ہے۔

افسانوں کا تنقیدی مطالعہ:

خالدہ حسین کا افسانہ **"سواری"** زندگی کی ایک بڑی حقیقت کو بیان کرتا ہے۔یہ ایک علامتی افسانہ ہے۔اس میں انھوں نے لال آسمان کا ذکر کیا ہے کہ کس طرح لال آسمان لوگوں کی توجہ کا مرکز بنتا ہے۔لال آسمان ہمارے ہاں ایک مِتھ *(Myth)* ہے۔یہ ایک ایسی مِتھ ہے جو ظلم و دہشت کا نشان ہے۔اور افسانے میں دوسرا ذکر انھوں نے بُو کا ذکر کیا ہے۔بُو ہے جو انسان کے دل و دماغ کو پوری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔پھر سفید رنگ کے بیلوں کی جوڑی کا ذکر ملتا ہے۔ بیل ہندی اساطیری نظام میں اہم حیثیت رکھتا ہے۔خالدہ حسین بتاتی ہیں کہ بیل کی جوڑی کہیں سے آتی ہے اور اس کے پیچھے ایک لکڑی کا کمرہ سا بنا ہوتا ہے۔ جس کے اندر سے بہت ہی تیز بو نکلتی اور پھیلتی ہے۔اور یہ بیل اس وقت آتے ہیں جب بہ وقتِ مغرب آسمان خون آمیز لال رنگ کا ہو جاتا ہے۔تب وہ بیل پریشان ہوتے ہیں اور لوگ بھی اس کی بو کی وجہ سے پریشان ہو جاتے ہیں۔یہ مغربی قوام کا مشرق والوں پر ظلم ظاہر کرتا ہے۔لوگ کس طرح اس لال سرخی کو دیکھ کر پریشان ہوتے ہیں۔یہ بو انسانوں کے جذبات کو ابھارتی ہے ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے۔ وارث علوی لکھتے ہیں:

خالدی حسین کی کہانی "سواری" میں ہمارے پُر تشدد عہد کی بھیانکتا کا بیان ہے۔[6]

Al-Qirtas ARABIC
ISSN Online : 2709-6076
ISSN Print : 2709-6068

اور یہ بوانسانوں میں منفی خیالات کے ظہور کی وجہ بنتی ہے۔ بیلوں کو مغربی اقوام سے تشبیہ دی گئی ہے کہ کس طرح مغرب کے لوگوں نے مشرقی اقوام کو دہشت اور تشدد کا نشانہ بنایا ہوا ہے۔ یہ کیفیت انسان کے جذبات کو الٹ دیتی ہے۔ جس طرح ایک انسان اچھا کام کرنے کے بعد بہت سکون محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح ایک انسان کوئی برائی کرے تو اس کے اندر کی آواز اس کے ضمیر کو جھنجوڑتی رہتی ہے کیونکہ برائی انسان کو کبھی سکون سے بیٹھنے نہیں دیتی۔ "سواری" میں بو کا عالم یہ ہے کہ جب وہ پھیلتی ہے تو لوگ بے چین ہو جاتے ہیں۔ وہ اندر ہی اندر تڑپتے ہیں۔

اس افسانے کی کہانی کی فضا مابعد الطبیعاتی ہے۔ یہ کہانی دراصل ایٹم کے پھٹنے اور اس سے اٹھنے والے دھوئیں سے متاثر ہونے والے افراد پر لکھی گئی ہے کہ وہ سرخی پہلے تو بس تین لوگوں کو متاثر کرتی ہے پھر آہستہ آہستہ پورے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور لوگ اپنی کیفیات اور جذبات کو بیان کر رہے ہوتے ہیں۔ خالدہ حسین کے دوسرے افسانوں کی طرح اس افسانے میں بھی منظر کشی بہت عمدگی سے کی گئی ہے۔ یہ ان کے مجموعوں میں سے سب سے عمدہ افسانہ ہے۔

خالدہ حسین کے افسانوں میں موجود انسان دوستی کا جذبہ بھی ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ جس کے لیے خالدہ حسین ہمیں مختلف قسم کے کرداروں سے متعارف کرواتی ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار "ممدو" انسان دوست ہوتا ہے۔ وہ صرف اپنی ذات کے دائرے ہی میں محصور نہیں۔ وہ بے بس، بے علم اور اَن جان اگرچہ ہے، لیکن وہ اپنے جذبات واحساسات میں اس قدر وسعت ضرور رکھتا ہے کہ اپنے ارد گرد موجود افراد سے محبت واحساس کا رشتہ استوار رکھ سکے۔ محبت کی اس دین کے عوض دوسروں سے وہ اپنے لیے صرف عزت اور انسانی احترام کی طلب رکھتا ہے، لیکن اُس کی اس عام سی مگر پُر خلوص طلب کو بھی دنیا والے کچھ نہ شمار کرتے ہوئے تضحیک کا نشانہ بناتے ہیں۔

"دہانِ زخم" ایک ایسی کہانی ہے جو ایک شخص کے گرد گھومتی ہے۔ ایک ایسا شخص جو ایک گاؤں سے دوسری اپنے رشتہ داروں کے پاس جاتا ہے۔ وہاں وہ سب کی باتوں کو برداشت کرتا ہے اور ان کے ساتھ رہتا ہے۔ اس کہانی میں بھوک کے احساس کو بھی خاصے منفرد انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ بھوک کس طرح سے انسان کو اپنا مطیع بنا کر جو چاہے کروا سکتی ہے۔ اس افسانے کا کردار بھی بھوک مٹانے کی خاطر وقتاً فوقتاً ذلالت کا شکار بنایا جاتا ہے۔

خالدہ حسین کی کہانیوں میں کردار خواہ کسی بھی شکل میں پیش ہوا ہو، وہ اپنی ذات کو منوانے کا خواہش مند اور اس کے اثبات کے لیے کوشاں نظر آتا ہے۔ انسانوں میں ستر فیصد ایسے لوگ ہیں جو اپنے مزاج کے مطابق ڈھل جاتے ہیں مگر کچھ لوگ انقلابی مزاج بھی رکھتے ہیں۔ وہ اسی کے مطابق اپنی زندگی میں اس چیز کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس کہانی میں جو کردار ہے وہ دن میں بھی اور رات میں بھی بس خواب ہی دیکھتا رہتا ہے۔ اس نے اپنی ایک الگ ہی دنیا بسائی رکھی ہے۔ اس کو اپنی ذات کے باہر کی دنیا سے کوئی لینا دینا نہیں۔ وہ تو جاگتے ہوئے بھی خواب دیکھتا ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے بھوک کا بہت زیادہ ذکر کیا ہے۔ اور اس بھوک کو آگ سے تشبیہ دی ہے کہ کس طرح بھوک کی آگ انسان کی خودداری کو نگل لیتی ہے اور انسان اس قدر بے حس ہو جاتا ہے کہ عزتِ نفس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ ایسی نفسیاتی کم مائیگی کا شکار اس افسانے کا کردار ڈانٹ کو ترستا ہے۔ وہ اپنے بھائی اور بھابھی کی ڈانٹ سنتا رہتا ہے، مگر اپنی ذات میں بھی مگن رہتا ہے اور اس کو ہر وقت اندر کا اَن دیکھا شخص نظر آتا ہے۔

اسی طرح ان کے ایک افسانے میں بکرے کا ذکر ہے کہ اس کا مالک اس کو بھوکا رکھتا ہے اور ناروا سلوک کا نشانہ بنا کر بالآخر کھانے کو دیتا ہے۔ بکرا محض کھانے کی اُمید و انتظار میں مالک کی ڈانٹ پھٹکار برداشت کرتا رہتا ہے اور ہر روز یہ سوچتا ہے کہ آج ہی اس کی بھوک ختم ہو جائے گی۔ مگر وہ نہ سمجھ جانور لاشعوری طور پر مالک کے ناروا سلوک کا عادی ہو جاتا ہے۔ انسانوں میں بھی یہ عادت فطری طور پر پائی جاتی ہے۔ انسان بھی صرف اسی در کی سنتا اور مانتا ہے کہ جس در سے اسے پیٹ بھرنے کو ملتا ہو۔

خالدہ حسین کے تمام افسانوں کے عنوانات مختلف ہیں، منظر کشی مختلف ہے، جزئیات مختلف ہیں مگر موضوعات ایک جیسے ہیں، حقائق ایک جیسے ہیں، احساسات ایک سے ہیں، کردار مختلف ہیں مگر محسوس کرنے کا طریقہ ایک جیسا ہے۔ اس افسانے میں بھی منظر کشی بہت عمدہ ہے اور دلکش ہے۔

اسی طرح سے خالدہ حسین کی کہانی **"مکڑی"** میں انسان کی پہچان کی بات کی گئی ہے کہ انسان کس طرح اپنی ذات کو پہچان سکتا ہے۔ جس طرح سے اس افسانے میں بار بار آئینے کا ذکر آتا ہے کہ ایک آئینے میں انسان اپنا آپ دیکھتا ہے۔ اسی طرح انسان کی اپنی ایک ذات ہوتی ہے اور وہ اپنی ذات کے آئینے میں خود کو پہچانتا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ہر روز ایک حجام کی دکان کے سامنے سے گزرتا ہے جو سڑک کے کنارے پر لگا رکھی تھی اور اس کے آئینے میں روز خود کو دیکھتا ہے۔ مگر وہ آئینہ اتنا اوپر لگا ہوا تھا کہ اس کا وہاں تک پہنچنا مشکل ہو جاتا تھا۔ یہ امر ایسے ہی ہے کہ جیسے ایک انسان میں ہزاروں برائیاں ہوتی ہیں مگر جب وہ ان برائیوں کو ذات کے آئینے میں دیکھتا ہے تو وہ خود کو پہچان لیتا ہے

Al-Qirtas ARABIC
ISSN Online : 2709-6076
ISSN Print : 2709-6068

۔آیئنے کی اونچائی اس حقیقت کی علامت ہے کہ انسان کو اپنی خامیوں کا علم ہو جانے کے باوجود انھیں قبول کرنے میں خاصا وقت لگ جاتا ہے۔ایک افسانے میں خالدہ حسین لکھتی ہیں:

مجھے وہ سات رنگ کا شیشہ یاد آگیا جو کبھی بچپن میں اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ مل کر روشنی کے سامنے رکھ دیتی تھی۔۔۔وہ رنگ اکیلے اس سات رنگے شیشے میں نہ نکلتے تھے۔ان کے ساتھ ہی وہ ایک خوش بُوئوں، سُروں اور محبت بھرے لمحوں کی لہریں تھیں کہ ارد گرد بہنے لگتی تھیں۔اور جاتے جاتے ایک نیم بے ہوش اداسی دل کو دے جاتی تھیں۔[7]

جس طرح سے کہا جاتا ہے کہ ایک انسان کے جسم کی بادشاہت اس کا سر ہے اور جو اپنی اس بادشاہت کو ہی نہ سمجھ سکے وہ خود کو کس طرح سے قابل قدر سمجھ سکتا اور دوسروں کو سمجھا سکتا ہے۔اور اگر کوئی خود کی بادشاہت کو سمجھ لے تو وہ اس کائنات کے ہر رنگ تک رسائی حاصل کر لے گا۔اس افسانے میں انسان کی اسی خود آگہی کی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے کہ یہ انسان کی کیفیات ہی ہیں جو اس سے سب کچھ کرواتی ہیں۔جب انسان خود کو نہیں پہچانے گا تو اس کی بادشاہت اس سے دور ہو جائے گی۔یہاں تک کہ اس کے جسم کے دوسرے اعضاء بھی دور ہو جائیں گے۔یہ اچھائی اور برائی کی بات ہے کہ اگر انسان اچھائی کرتا ہے تو اس کے اعضا اس کا ساتھ دیتے ہیں۔مگر جب انسان برائی میں پڑ جاتا ہے تو وہ اپنے اندر ایک ایسی کیفیت کو محسوس کرتا ہے جس طرح سے ریگستان میں جلتے انگاروں پر رواں ہو۔اور یہ ایک ایسا سفر ہوتا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔اس افسانے میں ایک ایسے فرد کے بارے میں بھی بات کی گئی ہے کہ جو شکست کھا کر بھی ہار نہیں مانتا۔اس میں ان دیکھے تسلط سے آزادی کی خواہش بھی نظر آتی ہے۔

خالدہ حسین کا مطالعہ اور وسعت اس کے مشاہدے کی دلیل ہے۔بعض اوقات زرخیز تخیل کی کاری گری سے ایک بات کو ایک مکمل افسانے کا پلاٹ مہیا ہو جاتا ہے۔مکڑی میں انہوں نے ایسے ہی پلاٹ کو اپنایا۔

"درخت" خالدہ حسین کا ایک اور اہم افسانہ ہے۔اپنے دوسرے افسانوں کی طرح یہاں بھی انسانوں کے داخلی اور باطنی تجربات اور اس کے نتیجے میں ہونے والی شکست اور ریخت کو اپنی کہانی کے قالب میں ڈھال لیتی ہیں۔ان کی کہانیوں میں نیند کا استعارہ پایا جاتا ہے اور سونے جاگنے کی کیفیت ماضی کی بازیافت کے عمل کے ساتھ مل کر کرداروں کی نفسیاتی کیفیات کو ابھارنے میں مدد دیتی ہے۔لکھتی ہیں:

اسے یوں لگتا ہے جیسے وہ چوکی پر بیٹھی بیٹھی سو رہی ہے۔نیند اور بیداری کی حدیں ایک دوسرے سے مل چکی ہیں۔[8]

اس افسانے میں خود پر اعتماد نہ ہونے کا ذکر ہے کہ انسان کو جب تک خود پر اعتماد نہیں ہو گا وہ تب تک زندگی میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔جس طرح سے ایک درخت ہے وہ بڑھتا، پھلتا، پھولتا ہے اور دوسروں کو فائدہ دیتا ہے۔اسی طرح انسان میں بھی خود کو سمجھنے اور خود پر اعتماد رکھنے کی صلاحیت ہونا ایک ضروری امر ہے۔ہرے بھرے درخت کا پھل نہ دینا اس امر کا غماز ہے کہ خود پر اعتماد کی کمی ذات میں ناامیدی اس قدر بڑھا دیتی ہے کہ انسان ہاتھ پاؤں مارے بغیر اپنی ناکامی کو اپنی قسمت کا لکھا شمار کرنے لگتا ہے۔جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ناامیدی کمبخت ہی سب کچھ نہیں، بلکہ انسان کو اس کمبختی کو چھوڑ کر آگے بڑھنا چاہیے۔

افسانے **"بازی گر"** میں خالدہ حسین نے معاشرے کے ایک غم ناک پہلو کو اجاگر کیا ہے۔اس افسانے کا کردار بچپن ہی سے مختلف طرح کے مشکل اور قدرے جان لیوا کرتب کرتا ہے۔اس کی ماں اس کے ان کاموں سے خوف زدہ ہو کر اور بچے کے سلامتی ہی کے پیشِ نظر ایک دن اس پر چیخ اُٹھتی ہے تو وہ گھر ہی چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ایک ایسی راہ پر جہاں انسان خود کو تلاش کرتا ہے اور اپنے آپ کو اس لائق بناتا ہے کہ وہ زندگی میں کوئی مقام حاصل کر سکے۔افسانے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

میں تو اماں کی انگلی پکڑ کر چل رہا تھا۔پھر جب آگے جا کر میں نے اماں کو دیکھا تو وہ کوئی اور تھا، اماں نہیں تھی۔وہ کون تھی؟[9]

اس افسانے میں زندگی کے حقائق کو بیان کیا گیا ہے کہ انسان جب زندگی میں کسی مقصد کے حصول کے لیے سرگرداں ہوتا ہے تو متعدد دیکھی اور اَن دیکھی مشکلات راستے میں در آتی ہیں جو حوصلے کی آزمائش اور نمٹ لینے کی اُمید کا سبب بنتی ہیں۔مگر جب کوئی اپنی زندگی سے ہار جاتا ہے، تھک جاتا ہے تو ان تمام مشکلات کو برداشت کرتے کرتے قدم قدم پر جس کسی کا بھی اشتراک ملتا ہے تو مزید سوالات جنم لیتے ہیں۔مثلاً، کیا ہم ایک ہیں؟ اگر بالفرض ہم ایک وجود ہیں تو یہ کس طرح سے ممکن ہے؟ اور اگر الگ ہیں تو کیوں کر؟

Al-Qirtas ARABIC
ISSN Online : 2709-6076
ISSN Print : 2709-6068

اس افسانے سمیت خالدہ حسین کے تمام افسانوں میں آیات، احادیث، اور اساطیر نہ صرف ان کے اسلوب کی بنت میں شامل رہتے ہیں بلکہ یہ ایک ایسی سحر انگیز اور پُر کشش فضا تیار کر دیتے ہیں کہ قاری سرا ہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی وجہ سے کشور ناہید نے انھیں اپنے افسانوں کی 'افسانہ نگار' کہا ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ خالدہ حسین مادیت کی بات کرتے کرتے اچانک عرفانِ ذات اور کائنات کے مراحل طے کرنے لگتی ہیں۔ اس افسانے میں انسانی تنہائی کے اسرار سے بھی پردہ کشائی نظر آتی ہے کہ انسان جب حالات کا سامنا کرتا ہے تو وہ ہجوم میں ہونے کے باوجود دراصل تنہا ہوتا ہے۔ اسے بہ ہر حال تنہا ہی ہر طرح کے حالات کو اپنی لیے ساز گار بنانا ہوتا ہے۔

افسانے **"دادی آج چھٹی پر ہیں"** کی کہانی ایک ایسے کردار کو بیان کرتی ہے جو اپنی دادی اماں سے بہت محبت کرتا ہے۔ حسبِ اسلوب اس میں علامتوں کا بھی استعمال ہوا ہے۔ کہانی میں بناسیٹوں والی گاڑی کا ذکر ہے۔ یہ گاڑی آ کر رکتی ہے۔ یہ ایک ایسی گاڑی ہے جس میں انسان کبھی بھی زندہ نہیں بیٹھتا۔ گویا یہ وہ گاڑی ہے جو عدم کے مسافروں کو لیے دنیا کے پڑاؤ سے اَن دیکھی منزلوں کی طرف رواں دواں ہے۔ اس افسانے میں "موت" کی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ ہر ذی روح کے لیے بہ ہر حال موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ موت اپنے وقت پر آن موجود ہوتی ہے۔ یہ سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

جب خالدہ حسین زندگی اور موت جیسے حقائق کو موضوعِ گفت گو بناتی ہیں تو وقت کا تصور ایک لازمی عنصر کی حیثیت سے اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس حوالے سے ان کا افسانہ **"کھڑکی"** ملاحظہ کیا جا سکتا ہے کہ دن کا اور رات کا ہونا ایک وقت ہے۔ اس طرح موت کا بھی ایک وقت ہے۔ جس کا بدلاؤ ممکن نہیں۔ اکثر خالدہ حسین نفسِ انسانی کو مقاربت، مماثلت یا تضاد کے سہارے ایک ذہنی کیفیت سے دوسری ذہنی کیفیت کو منتقل کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ یوں ان کے ہاں نہ صرف آزاد تلازمہ خیال ہے بلکہ شعور کی رو کی تکنیک بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔ لکھتی ہیں:

میں نے ہاتھ سے چاولوں کا نوالہ بنایا۔ نوالے بنا کر کھانا برا لسبا اور مشکل کام ہے۔ مجھے یاد آیا برسوں پہلے ماں نوالہ بنا کر کھلاتی تھی اور میں اپنی بہن سے بہت پہلے نوالہ بنانا سیکھ گیا تھا۔ حالانکہ میں اس سے کہیں چھوٹا تھا اور ماں بہت خوش تھی۔[10]

اپنی تحریروں میں وہ تشبیہات کا استعمال جا بجا کرتی ہیں اور دعوی کرتی ہیں کہ یہ تشبیہات اپنے اندر ایک مکمل کہانی رکھتی ہیں۔ وہ کولاج کی تکنیک کے استعمال سے مناظر اور واقعات کے جوڑ سے ربط اور مفہوم پیدا کرتی ہیں۔ ان کے تقریباً ہر مجموعے میں دو چار موضوعات ایسے ہیں جو کہانی کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے کہانی پڑھنے والے پر آگاہی کے نئے در منکشف کر دیتے ہیں اور زندگی کی حقیقت کو کچھ ایسے زاویے سے سامنے لے آتے ہیں جو قاری کے وہم و گمان سے بالا ہوتے ہیں۔

خالدہ حسین کا افسانہ **"سمندر"** ایک ایسی کہانی ہے جو پوری دنیا کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ جیسا کہ سمندر اپنے اندر بے شمار چیزیں سموئے ہوئے ہوتا ہے بالکل اسی طرح سے انسانی دل بے شمار رازوں کا ایک ایسا تہہ خانہ ہوتا ہے کہ جس تک چاہ کر بھی رسائی ممکن نہیں۔ سمندر میں موجود کئی چیزیں ہیں جن کا تعلق کسی نہ کسی طور سطح پر موجود چیزوں سے ہوتا ہے۔ اس کا وجود کوئی مانے یا نہ مانے مگر اس کا وجود ہے ضرور۔ اسی طرح انسان کے وجود سے کسی کو فرق پڑے نہ پڑے مگر اس کا ایک الگ وجود ہے۔ ڈاکٹر نورین رزاق لکھتی ہیں:

خالدہ حسین کے افسانے 'نام کی کہانی'، 'پہچان'، 'سایہ'، 'چینی کا پیالہ'، 'پیار کی کہانی'، 'نامہ بر'، اور 'سمندر' میں فلسفہ وجودیت کا پرتو کسی نہ کسی سطح پر موجود ہے۔[11]

اکثر خالدہ حسین کے افسانوں میں انسان کے وجود اور اس کی گہرائی کا تصور ملتا ہے۔ جس طرح سے وہ افسانے میں لکھتی ہیں کہ میں بس سمندر کو ہی سب کچھ سمجھتی ہوں۔ سمندر ایک ایسی جگہ ہے جہاں سب کچھ موجود ہے۔ اس کے اندر چیزوں کا انبار لگا ہوا ہے۔ اس سے مراد انسان کا اندر ہے۔ اگر کوئی سمندر میں زندہ ہے تو میں بھی ہو سکتی ہوں جس طرح سمندر سارے جانداروں کا ہے اسی طرح میرا بھی۔ یہ کائنات ہر ایک انسان کے لیے برابر ہے۔ چیزیں مختلف ہیں، لیکن وہ سمندر سب کے لیے برابر ہے، یعنی ہر انسان کے پاس احساسات کا سمندر ایک سا ہے۔ بس کسی کسی جگہ گہرائی میں فرق آ جاتا ہے۔ بس اس دنیا کے مناظر، اس کی وجودیت اور اس کی گہرائی سے آگاہی حاصل کرنا ہی ہمارا مقصد ہے، یعنی ہر زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصد ہے۔ جب تک ہم سمندر کی گہرائی کو نہیں جان سکتے ہم اپنی ذات اور اپنے وجود کے مقصد کی گہرائی کو بھی نہیں جان سکتے۔ خالدہ حسین کا افسانہ "سمندر" ہمیں اسی کا درس دیتا ہے کہ انسان کو اپنی گہرائی کو پہچاننا چاہیے کہ اس کی فکر، اس کی پہچان کتنی گہری ہے۔

Al-Qirtas ARABIC
ISSN Online : 2709-6076
ISSN Print : 2709-6068

خالدہ حسین کا افسانہ **"ابنِ آدم"** آزردہ روح کی ایک مثال ہے۔ آزردہ روح یا وجود کی تحقیر و تذلیل کی ایسی مثالیں "ابنِ آدم" اور **"جزیرہ"** میں ملتی ہیں جو 11 ستمبر کے حادثے کے اثرات، دہشت گردی، عراق کی جنگ اور اس کے حالات و واقعات پر مبنی ہیں، لیکن اس میں آدمیت کی تصویر کی تلخ حقیقت بھی موجود ہے جو انسانی حقوق کی بہ ظاہر ترجمان دنیا کی بڑی طاقتوں کے اصل اور قبیح چہروں پر سے نقاب کھینچ اتارتی ہے۔ "ابنِ آدم" کی کہانی دنیا کی نام نہاد مہذب اقوام کے ظلم و بربریت کی داستان بیان کرتی ہے۔ امریکہ اور اس جیسی ہی اس کی خدائی کی حامی دیگر بڑی طاقتوں نے افغانستان، فلسطین اور عراق کو یکے بعد دیگرے سفاکیت و بربریت کا نشانہ بنایا۔ ان اقوام کے ظالمانہ حکمت عملی کے نتیجے میں مسلمانوں میں شدید ردعمل ظلم کے خلاف خودکش حملوں کی صورت میں سامنے آیا۔ اپنے حق کے حصول اور بقا کی خاطر جان دینے والے یہی افراد دہشت گرد کہلائے۔ یہ افسانہ ان ہی حقائق کی صاف تصویر پیش کرتا ہے۔ خالدہ حسین نے اس افسانے کے توسط سے اپنے پُرآشوب دور کی نشان دہی بھی کی ہے۔

خالدہ حسین اپنے افسانوں میں نسوانی کرداروں کے مسائل، ادھوری خواہشات، بے وجودی اور نفسیات کا بیان عمیق مشاہدے سے کرتی ہیں۔ ان کا افسانہ **"آدھی عورت"** اس کی قابلِ قدر مثال ہے۔ اس افسانے کا اہم کردار ایک عورت ہے جو کہ اپنے آپ کو آدھا تصور کرتی ہے۔ جسم کے آدھے اعضاء دوسرے سے مختلف ہیں۔ وہ اپنے اس آدھے پن سے پریشان ہوتی ہے اور خوفزدہ ہو جاتی ہے۔ افسانے میں لکھتی ہیں:

ایک صبح وہ جاگی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کی داہنی آنکھ، باہنی آنکھ سے الگ ہے اور ان کا باہمی رابطہ ٹوٹ چکا ہے۔ اور ان چاروں نے باہم کام کرنے سے انکار کر دیا۔ تب وہ اپنے اس آدھے پن پر بہت پریشان ہوئی۔ خوف کا ایک گھنا سیاہ مرغولہ اس کے چاروں سمت پھیل گیا۔ [12]

خالدہ حسین اس افسانے کے ذریعے سے کہتی ہیں کہ عورت ذہین ہو یا جاہل، برابر ہے۔ عورت اور مرد میں جنگ وہی صرف انا کی ہے۔ عورت کم پڑھی لکھی ہو تو مرد ویسے ہی اسے کچھ نہیں سمجھتا اور اگر عورت مرد سے زیادہ پڑھ لکھ جائے تو مرد ڈپریشن کا شکار ہو کر اس پر ظلم کرتا ہے۔ مرد کم پڑھا لکھا ہو تو عورت دبانے کی کوشش کرتی ہے۔ اگر مرد زیادہ پڑھ لکھ جائے تو عورت ڈر جاتی ہے۔ حقیقتاً بہت مشکل ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے خوش رہیں۔ اس افسانے کی مرکزی کردار عورت اپنی انا پہلے ہی دن سے اپنے شوہر کے حوالے کر دیتی ہے۔ عزت دو یا پھر بے عزتی کرتے رہو۔ اس میں بے بسی اور بے حسی ملتی ہے کہ میں تو ایک بے جان چیز ہوں جو چاہے سلوک روا رکھو اور یہ بے حسی انسان میں تب آتی ہے جب وہ اپنے مقابل دوسرے انسان کو کئی بار آزما چکا ہو۔ وہ خود ہی قلعہ بند ہو گئی تو پھر کیسے کوئی اس کے اصل وجود اور احساسات تک رسائی کر سکتا ہے؟

اس افسانے میں معاشرے کے منافقانہ رویوں کا بھی ذکر ہے کہ ہم خود کو ویسا بنا لیتے ہیں جیسا دوسرے ہمیں دیکھنا چاہتے ہیں اور جیسا دوسرے ہمیں دیکھنا چاہتے ہیں، ہم اصل میں ویسے ہوتے نہیں۔ ہم خود کو دوسروں کی آنکھ سے دیکھتے ہیں اور خود پر خول چڑھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ افسانہ اس مشینی زندگی اور اس زندگی کے منافقانہ ماحول کی عکاسی کرتا ہے کہ اس معاشرے میں زمانے کے ساتھ چلنے کے لیے آپ کو خود پر خول چڑھانے پڑتے ہیں۔ کوئی کسی کو پہچان نہیں سکتا۔ کسی کو شناخت نہیں کر سکتا۔ ہمارے معاشرے میں عورت کوشش کرتی ہے کہ وہ معاشرے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلے۔ اپنے ارد گرد افرادِ خانہ کو خوش رکھ سکے۔ اس کے لیے روز صبح کو اٹھتی ہے۔ تگ و دو کرتی ہے مگر پھر بھی اپنے آپ کو اسی مقام پر واپس پاتی ہے جہاں سے شروع ہوئی تھی۔ اس کا شعور، جس کو اس افسانے میں باہنی آنکھ کہا گیا ہے، اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ وہ بہت کچھ کر لینے کے بعد بھی اپنی الگ شناخت بنا لینے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ وہ سب کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے میں تھک کر، ہانپ کر رہ چکی ہے۔ اور اس کی سکت جواب دے چکی ہے۔ اور اس کے تھک کر رہ جانے کے باوجود اس کے ساتھ چلنے والے اس سے ایک یا دو قدم نہیں، بلکہ صدیوں پیچھے ہیں۔

خالدہ حسین کے افسانوں میں وقت کا تصور کئی بار استعمال ہوا ہے۔ وہ وقت کو گزرتا اور آگے نکلتا ہوا بیان کرتی ہیں۔ کیونکہ وقت کسی کے ہاتھ نہیں آتا اس کے گزر جانے کا احساس گزرنے کے بعد ہوتا ہے۔ وقت کسی کے لیے بھی ٹھہرتا نہیں۔ اس افسانے میں بھی وقت کو اسی طرح آگے جاتا اور انسان کو اس کی گرفت میں جکڑا ہوا بیان کیا گیا ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ زمانے کی قسم بے شک انسان خسارے میں ہے۔ سب سے زیادہ یہ وقت جس انسان کے جسم کو کھاتا ہے وہ عورت ہے۔ اس وقت سے مراد اس دور کے رسم و رواج ہیں جس نے عورت کو دوسرے درجے کے جنس بنا دیا ہے۔ اس افسانے میں مردِ حق (حضرت یحییٰ) کی تلمیح استعمال کی گئی ہے کہ انھوں نے خود کو ایک درخت کے خول میں چھپانے کی کوشش کی مگر اس خول میں بھی ان کو آرے سے چیر دیا گیا۔ اسی طرح اس افسانے میں بھی عورت اپنے اوپر خول چڑھائے ہوئے تھی اپنے وجود کو چھپانے

Al-Qirtas ARABIC
ISSN Online : 2709-6076
ISSN Print : 2709-6068

کے لیے مگر معاشرہ اسے اس مقام پر بھی خوش نہیں رہنے دیتا۔ علامات کے پس پردہ خالدہ حسین بتاتی ہیں کہ معاشرے میں عورت کا روایتی تصور ہمیشہ حاوی رہتا ہے۔ جس کے مطابق اس کو پرکھا جاتا ہے۔ اگر کبھی وہ اپنی اصلیت یا مادی اور نفسیاتی وجود کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کر بھی لے تو سزا اس کا مقدر ٹھہرادی جاتی ہے۔

نفسیات کی کارفرمائی خالدہ حسین کے افسانوں میں نظر آتی ہے۔ یہ ایک ایسا ذہنی عارضہ ہے جس میں جذباتی عوامل طبیعاتی علامات پیدا کرتے ہیں۔ ایسانروس سسٹم کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یہ عارضہ ذہنی کیفیت کو متاثر کرتا ہے۔ اس کی مثال ان کے اس افسانے میں واضح ہے۔

خالدہ حسین کے افسانے **"نام کی کہانی"** کے عنوان سے ہی اس کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ یہ کہانی "نام" کے ارد گرد گھومتی ہے۔ یہ کہانی ایسی بے نام عورت کی کہانی ہے جو کہ اپنے نام کو ادھورا محسوس کر کے اپنی شناخت کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتی ہے۔ جس کا طلاق کے بعد نام ادھورا ہے۔ افسانے میں لکھا ہے:

۔۔۔قصہ ہی عجیب تھا کہ حرف سب کے سب موجود تھے اور مل کر ایک نام اب بھی بناتے تھے اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ یہی اس کا نام ہے۔ مگر مشکل یہ تھی کہ پہلے یہ لفظ وہ خود تھی مگر اب وہ محض خول تھا۔ وہ اس کے اندر موجود تھی۔ اب معلعم نہیں کہ اصل نام وہ خول تھا، یا وہ خود جس کا کوئی نام نہیں تھا۔[13]

جب ایک عورت کی طلاق ہوتی ہے تو اس کے نام کے ساتھ سے اس کے شوہر کا نام ہٹ جاتا ہے یعنی کہ آدھا رہ جاتا ہے کہ جس سے پہلے اس کی شناخت ہوتی تھی۔ عموماً ہمارے ہاں عورت کی شناخت اس کے باپ یا شوہر کے نام کے ساتھ جڑی ہوتی ہے۔ شادی کے بعد عورت کو باپ کے نام سے ہٹا کر شوہر کے نام کے سائے میں بٹھا دیا جاتا ہے۔ مگر طلاق کے بعد شوہر کا نام چھن جانے سے عورت کا نام ادھورا رہ جاتا ہے تو شناخت بھی ادھوری محسوس ہوتی ہے۔ اس کہانی میں کم مائیگی کا شدید احساس ملتا ہے۔ اس طرح کہ جیسے وہ اپنی ساری شناخت کھو چکی ہے۔ جس شوہر کی وجہ سے اس کی پہچان تھی، وہ اسے طلاق دے چکا ہے۔ اور یہ طلاق کا لفظ ہر وقت اسے بے چین کرتا ہے۔ جس سے وہ فرار حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے اور فرار کے لیے وہ مختلف کاموں کا سہارا لیتی ہے۔

خالدہ حسین کا تعلق مشرقی معاشرے سے ہے جہاں طلاق کا یہ لفظ نہایت برا سمجھا جاتا ہے۔ اس کو ایک لعنت کہا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں لوگوں کے خیالات مثبت نہیں ہوتے۔ خاص طور پر عورت کے لیے۔ طلاق یافتہ عورت کو یہاں یا تو ہمدردی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے یا پھر شک کی نگاہ سے۔ ایک طلاق کا دکھ اور دوسری طرف لوگوں کے سوالات جو کہ کچھ الفاظ کی صورت میں کرتے اور کچھ نظروں سے کرتے ہیں۔ خالدہ حسین نے معاشرے کی تلخ حقیقت کو بیان کیا کہ جب ایک عورت کو طلاق ہو جاتی ہے تو اس کا حسن بھی کہیں کھو جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو صرف ترس کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اس طرح وہ نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار بھی ذہنی، جسمانی اور نفسیاتی الجھنوں کا شکار تھا۔ اس نے اپنے اوپر خوشیوں اور رنگ برنگی زندگی کے دروازے بند کر دیے تھے۔ اس پر دکھوں کی کیفیت اس قدر طاری تھی کہ وہ اپنے آپ کو تکلیف میں رکھ کر تکلیف سے اطمینان محسوس کرتی تھی۔

"ہم جنس" خالدہ حسین کے علامتی افسانوں میں شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ افسانہ "ہزار پایہ" اور "ہم جنس" میں ذہنی الجھنوں کو سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہانی کا کردار اپنی ذہنی الجھنوں کو ایک کیڑے کی مانند سمجھتا ہے۔ خالدہ حسین کے اس افسانے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جب انسان کو اس دنیا میں بھیجا جاتا ہے تو اس پر بہت سی ذمے داریاں بھی عائد کر دی جاتی ہیں۔ وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں مشغول ہو جاتا ہے کہ اسے اپنا وجود چھوٹا اور ذمے داریاں زیادہ لگنے لگتی ہیں۔ جس طرح کسی ایک مشین کا کام مختص کر دیا جاتا ہے اسی طرح انسان بھی ایک مشین کی طرح اپنے فرائض کی ادائیگی میں ہمہ تن مصروف رہتا ہے۔ یہ ایک انسانی فطرت ہے کہ انسان شروع میں کسی کام سے محظوظ ہوتا ہے، لیکن ایک خاص مدت کے بعد وہ اکتا جاتا ہے۔ جس طرح ایک ان گنت ٹانگوں والا کیڑا اگر کسی جسم میں پوست ہو جائے تو اس کو نکالنا مشکل ہو جاتا ہے، اسی طرح ذمے داریوں کے کیڑے سے بھی فرار حاصل کرنا دشوار ہے۔

خالدہ حسین کے اس افسانے میں ہمدردی کا عنصر بھی موجود ہے۔ یہ بات انسانی جبلت میں شامل ہے کہ وہ کسی کے کام سے خوش نہیں ہوتا۔ اگر ایک انسان دوسروں کو خوش کرنے کے لیے خود کو مٹا بھی ڈالے تو بھی کسی ایک خطا پر اس کی ساری کارگزاریاں غارت کر دی جاتی ہیں۔ خالدہ حسین نے اپنے اس افسانے میں بکرے کا ذکر کر کے یہ بات سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ اگر جانور بھی کچھ عرصہ تک مالک کے ساتھ رہے تو مالک اور جانور کے درمیان انسیت کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ اور وہ اپنے مالک کے انداز، حرکات و سکنات اندازہ لگا لیتے ہیں کہ مالک ان سے خوش ہے یا نہیں۔ خالدہ حسین نے ایسی ان گنت محرومیوں کو محسوس کیا ہے۔ پوری نا ہونے والی خواہشات کا ذکر کیا ہے۔ ہر

Al-Qirtas ARABIC
ISSN Online : 2709-6076
ISSN Print : 2709-6068

انسان کی لامحدود خواہشات ہوتی ہیں، جنھیں پورا کرنے کی چاہ میں وہ خود کو ہلکان کر دیتا ہے۔ انسانی خواہشات ایسی ہیں کہ ان کو جتنا بڑھاوا دیا جائے، اس میں اسی قدر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ اپنی خواہشات کو محدود رکھتا ہے یا لامحدود۔ جب انسان خواہشات کو لامحدود کر دیتا ہے اور بہت سی خواہشات کو پورا نہیں کر پاتا تو اسے وہ محرومی کی صورت اپنے دل میں بیٹھا لیتا ہے اور اسے کالی بھوکی رات سے تشبیہ دیتا ہے۔

اس دنیا میں ہر انسان تماشائی اور تماش بین دونوں صورتوں میں کردار ادا کرتا ہے۔ وہ بیک وقت دوسروں کا تماشا دیکھتا بھی ہے اور خود دوسروں کے لیے تماشا بنتا بھی ہے۔ انسان خود کو تسکین پہچانے کے لیے دوسروں کی ذلت سے لطف اندوز ہو رہا ہوتا ہے جبکہ اس وقت وہ یہ بات بھول جاتا ہے کہ وقت کا پہیہ بہت ظالم شے ہے۔ یہ وقت اس پر بھی آسکتا ہے تو اگر ایسی حالت میں کوئی اس کا مذاق اڑائے تو کیسا محسوس کرے گا۔

خالدہ حسین اپنے اس افسانے کے ذریعے یہ بات واضع کرنا چاہتی ہیں کہ دنیا کی رنگینیوں سے ہم محظوظ ہوتے ہیں اور ہونا بھی چاہیے۔ لیکن ہمیں اس دنیا میں کھونا نہیں چاہیے۔ ان رنگوں سے کچھ سبق حاصل کرنا چاہیے۔ اور ہمارے لیے جو دو راستے اچھائی اور برائی کے مختص کر دیے گئے ہیں ان میں سے سیدھے راستے کی پہچان کر کے اسے اختیار کرنا چاہیے۔ اللہ نے جو اتنے سارے رنگ بنائے ہیں وہ اس لیے نہیں ہیں کہ ہم ان میں رنگ جائیں، بلکہ اس لیے ہیں کہ ان سے کچھ سیکھا جائے۔ خالدہ حسین یہ بتاتی ہیں کہ یہ دنیا اتنی پرکشش ہے کے پہلے پہل میں بھی ان رنگوں کے اثر میں آگئی تھی۔ اور ان کا اثر ایسا تھا کہ میں اپنی ذات کو بھی بھول گئی تھی۔ میں اپنی پہچان بھی کھو بیٹھی تھی۔ مجھے اس دنیا میں کیوں بھیجا گیا ہے؟ مجھ پر کیا فرائض عائد ہوتے ہیں؟ پھر میں نے خود کی تلاش شروع کی۔ خود کو ڈھونڈا اور اپنے مقصد میں کامیاب بھی رہی۔ اور اس طرح میں روحانیت کی طرف آئی۔

"ہزار پایہ" خالدہ حسین کا ایک اور علامت پر مبنی افسانہ ہے۔ اس میں بھی انھوں نے کیڑے کا ذکر کیا ہے۔ وہ اپنی تحریروں کے توسط سے قدرت کی پہچان کرانا چاہتی ہیں۔ ان کی تحریروں میں قدرت اور حشرات العرض کا بیان کثرت سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس افسانے میں ایک مرد کو بنیادی کردار کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ جس میں وہ کہتا ہے کہ مجھے ڈاکٹر نے بتایا ہے کے تمہارے اندر ایک ہزار پایہ ہے جو اندر ہی اندر پرورش پا رہا ہے۔ اس کردار کے خیال میں ڈاکٹر کی دکان سے واپسی پر اُسے احساس ہوتا ہے کہ اسے بہت چیزوں کے نام ذہن سے مدغم ہوتے جا رہے ہیں اور اب مجھے نام لکھنے چاہیے اسی بات کا ذکر وہ اپنے دوست سے بھی کرتا ہے۔

نام سے مراد کیا ہے؟ نام سے مراد ایک شخصیت ہے، ایک پہچان ہے۔ خالدہ حسین اپنے اس کردار کے ذریعے بتانا چاہتی ہیں کہ دنیا میں آنے والے ہر انسان کو لکھنا چاہیے جو کہ ایک ناممکن سی بات ہے۔ کیونکہ دنیا میں آنے والے ہر فرد کی یہ ذمہ داری نہیں ہے اور نہ ہی ہر کوئی یہ صلاحیت لے کر پیدا ہوتا ہے۔ ہر انسان کے ذمے مختلف کام عائد ہوتے ہیں جو اس نے کرنے ہوتے ہیں۔ اگر ہر انسان لکھنے لگا تو اس دنیا میں بہت سا مواد ہو جائے گا، اور ساتھ ہی بہت سے نام بھی۔ کیونکہ جب کوئی لکھے گا اس کی تصنیف کے ذریعے اس کا ایک نام منتخب ہو جائے گا اور اس طرح دنیا میں بہت سے نام جنم لیں گے۔ خالدہ حسین یہاں ادیب کی کیفیت بیان کر رہی ہیں کہ لکھنے کے لیے انسان کو وسیع مطالعہ ہونا ضروری ہے اسی لیے جب کوئی ادیب لکھنے لگتا ہے تو ایسے محسوس ہوتا ہے کہ اسے ابھی مزید مطالعہ کی ضرورت ہے اور اس طرح وہ مزید مطالعہ کرتا ہے۔ اور پھر سے لکھنے کا آغاز کرتا ہے اس قدر محنت کی وجہ سے اسے تھکن ہونے لگتی ہے جس سے اس جبڑے کھل جاتے ہیں اور دیکھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ اسے کوئی بیماری لاحق ہے۔

خالدہ حسین اس افسانے کے ذریعے سے انسان کو اس دنیا میں ہمیشہ کی زندگی کے حصول کا گر بتا رہی ہیں کہ اس میں اگر کوئی انسان ہمیشہ زندہ رہنا چاہتا ہے تو اس کے لیے اسے کچھ کرنا ہوگا۔ یہ دنیا فانی ہے یہاں سے جانے کے بعد انسان کا وجود آہستہ آہستہ ختم ہو جاتا ہے، لیکن اگر کوئی انسان کچھ کر جائے تو وہ زندہ رہتا ہے۔ کوئی ادیب جب اس دنیا سے جاتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے جانے کے بعد اس کے ساتھ اس کا فن بھی دفن ہو جائے گا، لیکن اس کی آخری تحریر ہمیشہ زندہ رہتی ہے بلکہ اس شخص کو بھی زندہ رکھتی ہے۔

ماحاصل:

اردو افسانے، بالخصوص علامتی افسانہ نگاری میں محترمہ خالدہ حسین کا نام بلاشبہ ایک سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ اردو میں علامتی ادب کا ذکر ان کے نام اور کام کے حوالے کا ہمیشہ محتاج رہے گا۔ علامتی طرزِ اظہار اگرچہ اس لیے بھی قابلِ قدر شمار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی بنیاد کم حوصلگی، خوف اور بات کہہ کر معنی سے مکر جانے کے عناصر پر اُستوار ہے۔ اس طرزِ

Al-Qirtas ARABIC
ISSN Online : 2709-6076
ISSN Print : 2709-6068

اظہار کے وجود پانے میں آزادیِ اظہار پر حکومت وریاست کی جانب سے جبر وقدغن کو بنیادی کردار حاصل ہے۔ لیکن بہ ہر حال بعدازاں یہ ایک فن کے طور پر متعارف ہوا اور بہت سے لکھاریوں نے اعلانیہ قوتِ اظہار کے ہوتے ہوئے بھی دانستہ اس میں طبع آزمائی کی اور خوب داد پائی۔

خالدہ حسین کے افسانوں کے عنوانات اگرچہ جدا جدا ہیں مگر موضوعات قریباً ایک سے ہیں۔ موضوعات بہت جان دار ہیں اور ہمارے معاشرے کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کرتے ہیں۔ فرد کی محرومیوں، اداسیوں، مایوسیوں، ذہنی اور نفسیاتی الجھنوں پر انھوں نے نہ صرف کہانی کو بُنا ہے بلکہ بین السطور مذکور تمام مسائل کے حل کی نشان دہی بھی ساتھ ساتھ کرتی چلی گئی ہیں۔ کہانی کی شہ راہ کو اساطیری قمقموں سے سجاتے اور آگے بڑھاتے ہوئے وہ اس کے تمام تر الجھاؤ کا خاتمہ دین وشریعت سے قرب میں تجویز کرتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں پیغام کی اندرونی لہر موجود کے جو مطالعے کے دوران ہی قاری پر خود بہ خود منکشف ہوتی ہے۔ ان کے افسانے قدرتی عناصر سے مالا مال ہیں۔ وہ اپنے پیغام کو فطری انداز سے قاری تک ترسیل کے فن سے بہ خوبی واقف ہیں۔ کہیں بھی کہانی کا مزاج فطرت سے فاصلے پر محسوس نہیں ہوتا۔ جو کچھ کہ وہ بیان کرتی ہیں، وہ معاملات دنیا میں کسی نہ کسی کو کسی نہ کسی صورت درپیش ہیں۔ نام کا مسئلہ، کم مائیگی کا احساس، بے قدری کی خلش، ذمے داریوں کا بوجھ، دوسروں کو خوش کرنے والا کارِ ناتمام، چاہے جانے کی بھوک اور ان گنت نفسیاتی الجھنیں وجذباتی محرومیاں انسان کے دامن گیر رہتی ہیں۔ مذکور تمام مسائل جنس دیکھے بغیر وار کرتے ہیں۔ ان کا شکار مرد وخواتین، ہر دو اصناف ہیں۔

ان کے اکثر افسانوں میں بھوک کا ذکر ہے، جیسے کوئی شدید خواہش پوری نہ ہوئی ہو اور اس کی بھوک باقی ہو۔ لکھاری ایک آدھ کہانی کسی کیفیت پر لکھے تو مشاہدہ کہا جا سکتا ہے مگر ہر لکھاوٹ میں ایک خاص کیفیت رنگ وعنوان بدل بدل کر آئے تو یقیناً تجربہ کہلائے گا جو کسی چوٹ، کسی آرزو کی ناتمامی یا کسی نفسیاتی الجھن کے سبب وجود پاتا ہے۔ اعصاب شکن ذہنی اذیت کو نکاس کی راہ نہ ملے تو انسان خود سوزی سے ہوتا ہوا خودکشی تک جا پہنچتا ہے۔ خالدہ حسین کا قلم اُن کے کرب کے نکاس کا سبب بنا۔

حوالہ جات
(References)

1. *https//www.aikrozan.com*
2. امینہ بی بی: خالدہ حسین (شخصیت اور فن) (2017ء)، اسلام آباد: اکادمی ادبیات، ص17۔
3. امینہ بی بی: خالدہ حسین (شخصیت اور فن)، ص18۔
4. محمد ڈاکٹر اجمل: حرفِ اول، مشمولہ: دروازہ (1984ء)، کراچی: خالد پبلی کیشنز، ص47۔
5. امینہ بی بی: خالدہ حسین (شخصیت اور فن)، ص16۔
6. وارث علوی: اپنے سائے سے ملاقات، مشمولہ: اردو افسانے ترتیب وانتخاب (2017ء)، کراچی: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ص34۔
7. امینہ بی بی: خالدہ حسین (شخصیت اور فن)، ص12۔
8. امینہ بی بی: خالدہ حسین (شخصیت اور فن)، ص73۔
9. امینہ بی بی: خالدہ حسین (شخصیت اور فن)، ص33۔
10. ڈاکٹر طاہر مسعود: یہ صورت گر کچھ خوابوں کے (1985ء)، کراچی: اکادمی بازیافت، ص292۔
11. ڈاکٹر نورین رزاق: پاکستانی خواتین افسانہ نگار (اردو افسانے کی روایت کے تناظر میں) (2016ء)، لاہور: دستاویز مطبوعات، ص341۔
12. آصف فرخی: اردو افسانے ترتیب وانتخاب (انتخاب خالدہ حسین) (2017ء)، لاہور: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ص57۔
13. آصف فرخی: اردو افسانے ترتیب وانتخاب (انتخاب خالدہ حسین)، ص17۔